اسلام میں ریاست کا تصوّر

(از مولوی محمد آصف صاحب سیوہاروی۔ بی۔ اے)

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر　　کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت　　شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

زہر ہیں جو اثر خدا نے ودیعت کیا ہے وہ سب انسانوں پر کم و بیش اثر کرتا ہے۔ اگرچہ زہر کا اثر وہی رہتا ہے پھر بھی قویٰ کے لحاظ سے مختلف انسانوں پر مختلف اثرات ہوتے ہیں۔ کسی پر کم کسی پر زیادہ بالکل اسی طرح "الناس علیٰ دین ملوکھم" کا اثر ہر قوم پر ہونا ازبس ضروری ہے۔ مگر مضبوط اقوام پر کم اور کمزور اقوام پر زیادہ۔ فی زمانہ یورپ کی مادہ پرستی "تلخی کام و دہن" کے معاملہ سے تجاوز کر کے "رگ و پے" میں سما گئی اور دین کا چراغ بظاہر تہذیب کے قمقموں کے سامنے دھیما پڑ گیا۔ مسلمان جو کبھی "اللہ کا شیدائی تھا" اور استغنائے مسلمانی کے زور پر دنیا کو حقیر سمجھتا تھا۔ آج احتیاج کے سامنے سرنگوں نظر آتا ہے۔ یورپ کی سامریت نے اس کو اس درجہ مسحور کر رکھا ہے کہ وہ دنیا کو اپنا حاصل سمجھنے لگا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا کہ جسمانی اور اقتصادی انحطاط کے ساتھ ساتھ اس کا ذہنی انحطاط بھی شروع ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے اپنی شخصیت اہلِ یورپ کے حوالے کر دی۔

افلاطون (Plato) سے لے کر لاسکی (Laski) تک ہزاروں سیاسی نظریے بنے اور بن بن کر بگڑے۔ یونانی اور روم کی شہری حکومتوں سے لے کر موجودہ دور کی حکومتوں تک ہزارہا قسم کی حکومتیں اس دنیا میں قائم ہوئیں اور کل من علیہا فان کا جام پی پی کر اس خاکدانِ عالم کو الوداع کہہ گئیں۔ پچھلی تین صدیاں تاریخِ سیاست میں بہت اہم ہیں۔ اس درمیان میں نئے نئے نظریے دنیا کے سامنے آئے اور حکومت کے نئے نئے تجربے کئے گئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہندوستان کا تعلق یورپ سے روز بروز گہرا ہوتا

چلا گیا اور رفتہ رفتہ ہمارے دماغوں پر یورپ نے پورا پورا قبضہ کر لیا۔ آج مغرب پرست مسلمان کی معراج یہ ہے کہ اگر اشتراکیت (Socialism.) کا تذکرہ ہو تو کلام الٰہی سے ثابت کر دکھائے کہ قرآنِ عزیز صرف اشتراکیت سکھاتا ہے اگر اشتمالیت (Communism.) کی بحث چھڑ جائے تو قرآن شریف اور مارکس (Marx) کی کتاب میں کوئی فرق باقی نہ رہے اسی طرح اس کے نزدیک جمہوریت (Democracy) ملت پروری (Nationalism.) اور دینی حکومت (Theocracy) سب برحق ہیں اور سب قرآن سے ثابت کی جا سکتی ہیں اس کی اس خیرگی پر جتنا ماتم کیجئے کم ہے ؎

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

صرف یہی نہیں کہ یہ لوگ موجودہ زمانہ کے طوفان میں بہہ نکلے ہیں۔ اور انھیں صدائے حق بلند کرنے کی جرأت نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اس سے ان کی ناواقفیت اظہر من الشمس نظر آتی ہے۔ نہ وہ ان نظریوں کی اہمیت سمجھتے ہیں اور نہ وہ اسلام کے اصول سے واقف ہیں۔ ان کی تحریر اور تقریر صرف اس لئے ہے کہ دنیا ان کو قدامت پسند اور تنگ نظر نہ خیال کرے۔ وہ "بازمانہ ستیز" کے مسئلہ پر کیا کاربند ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ "بازمانہ بساز" کے معاملہ سے بھی ناواقف ہیں۔ قرآن کریم کی آیتوں کو سیاق و سباق سے قطع نظر جس طرح چاہتے ہیں معنی پہنا دیتے ہیں اور یہی معاملہ دوسرے مصنفین کی کتابوں کے ساتھ برتتے ہیں۔ دنیا کے تمام نظریوں میں کچھ نہ کچھ باتیں ایک سی پائی جاتی ہیں۔ وہ اس لئے کہ دنیا کے تمام آدمی خواہ وہ نوح علیہ السلام کی امت سے وابستہ ہوں یا موجودہ دور سے متعلق، وہ ہندوستانی ہوں کہ جرمنی، چینی ہوں کہ امریکی، جاہل ہوں کہ عالم۔ اشتراک جنسی و نوعی کی وجہ سے ان سب میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور جب انسان کے لئے کوئی قانون بنے گا تو اس میں بہت سی باتوں کا مشترک ہونا ناگزیر ہے۔ اسی طرح مذکورۂ بالا نظریوں اور اسلام میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں وہ اس لئے کہ دونوں انسان سے بحث کرتے ہیں لیکن اس کا یہ منشا نہیں کہ اسلام ان تمام نظریوں کی موافقت کرتا ہے۔ اسلام کا خود اپنا ایک سیاسی تصور ہے اور اسی طرح ریاست (State) کا تصور بھی وہ سب سے علیحدہ پیش کرتا ہے اور چونکہ اسلام کا تصور ریاست

فطرت کے مطابق ہے اور انسانی تعصب سے پاک ہے اس لئے وہ سب سے افضل و برتر ہے۔ اسلامی تاریخ اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ کس طرح اسلامی اصولوں نے دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا اور ہم "مغرب زدہ" لوگوں کی اس کم نظری پر متعجب ہیں کہ وہ کس طرح یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اصول جنھوں نے خستہ قوموں میں ایک توانائی کی لہر دوڑا دی تھی آج دنیا کے زخم کا مداوا کرنے سے معذور ہیں۔

کشادم دام بر گنجشک و شادم یاد ان ہمت
کہ گر سیمرغ می آمد بدام آزاد می کردم

رہا زمانہ کی موافقت کرنے کا سوال تو اس کا فیصلہ قرآن عزیز نے سینکڑوں برس پہلے کر دیا ہے۔

ولن ترضیٰ عنک الیھود ولا النصاریٰ (اور یاد رکھو) یہود تم سے خوش ہونے والے نہیں جب تک
حتیٰ تتبع ملتھم۔ تم ان کی ملت کی پیروی نہ کرو اور یہی حال نصاریٰ کا ہے

یہ اصول جس طرح پچھلی قوموں پر صادق آیا۔ موجودہ انسانوں پر بھی صادق آتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور عام غلطی کی بھی اصلاح ضروری ہے۔ مسلمانوں میں جو رسم و رواج پائے جاتے ہیں۔ جو طرز معاشرت ان لوگوں نے بنا رکھا ہے۔ جس اخلاق کا مظاہرہ یہ کرتے ہیں۔ جس قسم کی حکومتیں ان کی قائم ہوئیں۔ ان سب کو اسلام سے متعلق سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ ایک بڑی بھول ہے، نہ اسلامی ممالک اسلام پر کاربند ہیں نہ ان کا طرز حکومت اسلامی ہے اور نہ ہر مسلمان اسلام کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ اسلامی حکومت جس کی بنا نبی آخر الزماں (صلعم) نے ڈالی تھی اور جس کی آبیاری خلفا نے اپنے خون جگر سے کی۔ جس کی ترقی کا باعث حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے قول و فعل بنے اور جس کو قائم رکھنے کی کوشش حضرت عثمانؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کی وہ ان بزرگوں کے بعد قائم نہ رہ سکی اسلامی حکومت کا یہ پودا ابھی پوری طرح پروان نہ چڑھنے پایا تھا کہ بنو امیہ کی کام جوئیوں کے تیر نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور یزید کی حکومت سے لے کر موجودہ حکومتوں تک مسلمانوں کی سلطنتیں قائم ہوئیں لیکن اسلامی حکومت قائم نہ ہو سکی۔ ابن معاویہ سے مسلمانوں کی حکومت کی تاریخ شروع ہوتی ہے جو اسلامی حکومت کی تاریخ سے یکسر جدا ہے۔ اور دونوں چیزوں کو ایک سمجھنا سراسر غلط ہے اسلامی حکومت

کی تاریخ خلفاء کے زمانہ سے آگے نہیں بڑھتی اس لئے کہ اس کے بعد سے غیر اسلامی طریقوں نے راہ پائی۔ اور حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے کو نامزد کر کے بادشاہت کی بنا ڈالی جو اسلام کی اسپرٹ کے بالکل منافی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ "ریاست" کا تصور اربابِ فلاسفہ کی نظر میں کیا ہے اور اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ "ریاست" کی تعریفیں برسات کے کیڑوں کی طرح بے شمار ہیں۔ ہم مندرجہ ذیل چند تعریفوں پر قناعت کریں گے۔ انگریز مفکر ہالینڈ (Holland.) نے ریاست کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"انسانوں کا کثیر التعداد (انبوہ) اجتماع ایک قلمرو (ملک محروسہ) میں آباد۔ جن میں اکثریت یا قابلِ تحقیق جماعت کے افراد کی رائے، اس قسم کی اکثریت یا جماعت کی طاقت کے سبب اس تعداد پر فوقیت حاصل کرے جو اس کے خلاف ہو۔" [۵۱]

جرمن مصنف سی ڈل (Seydel.) کی رائے ہے کہ "ایک ریاست اس وقت وجود میں آتی ہے جب انسانی افراد کی ایک تعداد جو زمین کے ایک حصہ پر قابض ہوں کسی رفیع عزم کے ماتحت آپس میں متحد ہو جائیں۔" [۵۲]

گروشز (Grotius.) کے نزدیک ریاست (Civitas.) اس کا نام ہے کہ "آزاد انسانوں کی ایک مکمل سوسائٹی حق کے مفاد سے مستفیض ہونے اور باہمی اتفاق کی خاطر متحد ہو جائے۔" [۵۳]

بلنٹ شلی (Blunt Schli.) کے نزدیک "ریاست ایک خاص ملک محروسہ کے سیاسی مقصد کے لئے منظم باشندوں کا نام ہے۔" [۵۴]

ممالک متحدہ امریکہ کی سپریم کورٹ (Supreme Court.) نے ریاست کی تعریف ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ایک مرتبہ اس طرح کی تھی کہ "ریاست ایک آزاد انسانوں کی مشترک مفاد کے لئے متحد جماعت کا نام ہے۔ جو کچھ اپنا ہے اس سے مستفیض ہونے کے لئے اور دوسروں کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے۔" [۵۵]

---

[۵۱] ابتدائی اصول قانون چھٹی اشاعت صفحہ ۴۰ — Elements of Jurisprudence 6th ed. P. 40.

[۵۲] صفحہ ۱ و ۴ — Grundzuge einer allgemeine Staatsleehre. P. 1. 4.

[۵۳] De Jure Belli et Pacis bk. 1, ch 1, Sec 13 (Whewell's ed. P. 18)

[۵۴] Allgemeine Staatslehre ج ۱ ص ۲۲ —

[۵۵] Chisholm V. Ga., 2 Dall 456.

ریاست کی بہترین تعریف جس میں ریاست کے تمام سیاسی اور روحانی اجزا شامل ہیں گارنر (Garner) نے اپنی کتاب (Introduction of Political Science صفحہ ۴۱) پر اس طرح کی ہے کہ "ریاست ایک افراد کی برادری (Community) ہے۔ کم و بیش وسیع، مستقل طور سے ایک معین حصۂ ملک محروسہ پر قابض، بیرونی تسلط سے آزاد اور ایک منظم حکومت کی حامل جس کی دائمی تابعداری باشندوں کی ایک بڑی جماعت کرتی ہو"

ہم ان تعریفوں کی روشنی میں وہ اجزا آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں جن سے مل کر ریاست ظہور میں آتی ہے۔

(۱) پہلا ضروری جزء۔ انسانوں کی جماعت ہے جو مشترک مفاد کے خاطر آپس میں متحد ہو۔

(۲) دوسرا جزء:۔ ایک معین حصہ ملک محروسہ پر قبضہ ہے۔

(۳) تیسرا جزء:۔ بیرونی تسلط سے آزادگی۔

(۴) چوتھا جزء:۔ ایک مشترک اعلیٰ و برتر حکومت جس کے ذریعہ سے مجموعی رائے کا مظاہرہ اور اس رائے پر عملدرآمد ہو۔

ارباب فلسفہ میں ریاست کے اجزاء کے متعلق اختلاف ہے۔ بورن ہاک (Born hak) صرف تین جزء ضروری خیال کرتا ہے "ایک معین ملک محروسہ، ایک آبادی اس سے وابستہ، اور ان دونوں کا ایک برتر حکومت کے محکوم ہونا" بیرونی تسلط سے آزادگی ایک ضروری جزء بورن ہاک کے یہاں نہیں پایا جاتا ہے لیکن اگر ذرا غور سے اس کی تعریف پر نظر ڈالی جائے تو برتر حکومت سے یہ جزء خود بخود نکل آتا ہے۔ بورن ہاک کے تصور سے قطع نظر ہم کسی ایسی حکومت کو برتر کہنے کے لئے تیار نہیں جس پر بیرونی تسلط ہو۔ اور ایسی حکومت برتر کہلائی جا سکتی ہے۔ ولوبیائی (Willoughby) نے اپنی کتاب "Nature of State" میں صفحہ ۴ پر ریاست کے ضروری اجزاء سے بحث کی ہے اور اس نے تین جزء قرار دیئے ہیں۔

آبادی۔ حکومت اور حکومت کے لئے ایک قانون کا مجموعہ تحریر یا غیر تحریری ملک محروسہ اور بیرونی تسلط سے آزادگی کا ذکر نہیں کیا بلکہ حکومت ہی کے ایک ضروری جزء کو ریاست کا ایک تیسرا جزو قرار دیا ہے۔

اب ہم مذکورہ چاروں اجزاء کی اہمیت پر غور کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر وہ علم و عمل جس کی حرمت اسلام سے ثابت نہیں ہوتی وہ موجبِ صد تحسین ہے۔ اسلام اندھی تقلید کی اجازت نہیں دیتا اور دنیوی معاملات میں اس نے انسان کو ضروری آزادی عطا کی ہے اور تمام عقائد کی بنیاد عقل کو قرار دیا ہے۔ چونکہ ریاست ایک انسانی پیداوار ہے اور جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ریاست بھی دنیا کی اور چیزوں کی طرح ارتقائی منزلوں سے گذری ہے اسی لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ سیاسی فلسفہ کے ماتحت اس پر بحث کریں اور وہ اصول جو اربابِ فلاسفہ نے قائم کئے ہیں ان کو مباح سمجھیں اور علیحدہ علیحدہ جزر کے ماتحت یہ دکھائیں کہ اسلام کا ہر ہر جزو کے متعلق کیا حکم ہے۔

(۱) آبادی | اس بات سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ انسانوں کی آبادی ریاست کے قیام کے لئے ضروری ہے۔ جانور اور پرند تو باہم مل کر ریاست قائم کرنے سے رہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسانوں کی یہ جماعت مشترک مفاد کے لئے آپس میں متحد ہو۔ آبادی کا تصور زمانے کے اعتبار سے ہر دور میں بہت مختلف رہا۔ یونان و روم کی حکومتیں تھیں اور اس زمانے کے فلاسفہ کا تصور اسی کے مطابق رہا۔ ارسطو کا خیال تھا کہ آبادی کی ایک تعداد مقرر ہونی چاہئے جو نہ زیادہ ہو اور نہ کم" زیادہ اتنی کہ دوسروں کی محتاج نہ رہے اور کم اتنی کہ آسانی سے اس پر حکومت کی جا سکے۔

روسو (Rousseau) کا خیال تھا کہ آبادی اور ملکِ محروسہ میں تناسب ہونا ضروری ہے لیکن وقت کی تبدیلی سے یہ تصورات بھی مٹ گئے اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی ریاستیں بھی ہیں اور بڑی سے بڑی بھی۔ اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کس طرح چھوٹی ریاستیں بڑی ریاستوں کا لقمہ بن جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ زمانہ پھر آجائے جب طاقت و کمزوری کی یہ جنگ ختم ہو جائے اور اللہ کا قانون سب پر یکساں حاوی ہو۔ انسان اپنے اس ظلم سے شرما کر توبہ کرے اور جب ایسا وقت آئیگا تو اس کے لئے خدا کا بنایا ہوا قانون موجود ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (اور دیکھو) سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑلو

وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ اور جدا جدا نہ ہو۔

اسلام میں تفریق کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اور وہ سب کو یکجا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام کی ریاست تمام بنی نوع انسان کو اپنے میں شریک کرنے کی خواہشمند ہے اور یہی حکم ربانی ہے۔

یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی — اے لوگو تم اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم سب کو

خلقکم من نفس واحدۃ۔ — ایک نفس سے پیدا کیا۔

وان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ — اور دیکھو یہ تمہاری امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے

وانا ربکم فاتقون۔ — اور میں تم سب کا پروردگار ہوں پس (میری عبودیت و نیاز

(الآیہ) — کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ اور) نافرمانی سے بچو۔

جو لوگ خدا کو رب العالمین اور نبی اکرم (صلعم) کو رحمۃ اللعالمین مانتے ہیں وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ منشاءِ الٰہی یہی ہے کہ تمام دنیا میں کوئی تفریق باقی نہ رہے اور بنی نوعِ انسان ایک جگہ جمع ہو کر بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کریں۔ عرفی کا مشہور و معروف شعر ہے کہ ؎

دردلِ ماغمِ دنیا غمِ معشوق شود — بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

عرفی نے اس جگہ نفسیات کی اس بڑی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جو چیز ہمارے دماغ پر مسلط ہوتی ہے وہ دوسری چیزوں کو اسی سانچہ میں ڈھال لیتی ہے۔ ہم دوسرے الفاظ میں اس کو اس طرح کہیں گے کہ انسان اپنے تعصبات کے سامنے ایک گونہ اندھا ہوتا ہے جو زاویۂ نگاہ اس کا قائم ہو جاتا ہے وہ اس سے مشکل سے ہٹ سکتا ہے۔ یہی حال ہمارے مغربی رہبروں کا ہے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد سے ہر شخص پر یہ بات واضح ہو گئی کہ بنی نوع کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے سے پورا نظامِ سیاسی منتشر ہو رہا ہے اور یہ نظام کبھی ٹھیک طور پر قائم نہیں ہو سکتا جب تک ساری انسانی برادری ایک زنجیر میں منسلک نہ ہو جائے اور اسی وثوق کے ماتحت لیگ آف نیشنس (League of Nations) قائم ہوئی اور آج بھی سیاسی فلسفی ہو، مفکر ہو یا عملی سیاست دان۔ اس بات پر متفق نظر آتا ہے کہ "سب مل جل کر رہو اور جدا جدا نہ ہو" مگر اگر آپ اسی کو اس طرح کہدیں کہ "سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو" تو یہی بات کورِ عقلی قدامت پرستی اور جہالت سے تعبیر کی جائے گی مگر ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کا وعدہ کسی نہ کسی دن ضرور پورا ہو گا۔

بل نقذف بالحق علی الباطل　اور ہمارا قانون یہ ہے کہ حق باطل سے ٹکراتا ہے اور اسے پاش پاش کر دیتا
انّ الباطل کان زھوقا۔　ہے اور پھر اچانک ایسا ہوتا ہے کہ وہ نابود ہو گیا۔

اور پھر ایک بار تمام انسانی برادری ایک جگہ جمع ہو کر خدا کے بنائے ہوئے قانون کی تصدیق کریں گے کہ واقعی بہتری اور فلاح اسی میں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جیسا ابھی کہا گیا وہ اس کو اپنی ہٹ دھرمی سے تسلیم نہ کریں مگر دین عین فطرت ہے اور انسان اپنی فطرت کو زیادہ عرصہ تک نہیں جھٹلا سکتا۔ اس کو اپنی فطرت پر واپس آنا ہے وہ جس راہ سے بھی آئے۔

(۲) قلمرو یا ملک محروسہ | جس طرح ریاست کی ذاتی بنیاد آبادی پر ہے۔ اس کی طبعی بنیاد ملک پر ہے ایک قوم مستقل ریاست نہیں بنتی جب تک کہ وہ ایک ملک محروسہ حاصل نہ کرے۔" (بلنٹ شلی)

اس دعویٰ کی سب سے بڑی دلیل یہودی قوم ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ قوم ابتدا سے منظم رہی۔ لیکن جب تک خانہ بدوشی کی حالت میں رہی اس کو کوئی ریاست کہنے کے لئے تیار نہیں ہو سکا مگر اب جبکہ وہ فلسطین کے اندر آباد ہو گئی تو یہودی ریاست کی بنیاد پڑی۔ یہ بات اب بھی مشتبہ ہے کہ یہودی سلطنت ریاست کہلائے جانے کی مستحق ہے یا نہیں۔ اسی طرح جرمنی قبیلے سلطنت روما کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد خانہ بدوشی کی حالت میں رہے اور اُس وقت تک ریاست کی بنیاد نہیں پڑی جب تک وہ ایک ملک محروسہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر نہ ہو گئے۔ یا جنوبی افریقہ کے نقل وطن کرنے والے بوئر (Boers) جب اپنے ابتدائی گھر کو چھوڑ کر شمال کی طرف ایک نئے گھر کی تلاش میں چلے اور ایک عرصہ تک خانہ بدوشی کی حالت میں رہے۔ ریاست نہیں بنے جب تک کہ وہ ایک ملکِ محروسہ پر آباد نہیں ہو گئے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قلمرو میں زمین، دریا، جھیل، پہاڑ وغیرہ سب کچھ شامل ہوتا ہے اور ریاست کا قبضہ اپنی قلمرو کی ہر ہر چیز پر یکساں ہونا ضروری ہے۔

قلمرو کی حدود کے متعلق بھی بعض اربابِ فلسفہ کا خیال ہے کہ ملکِ محروسہ کا تعین ازبس ضروری ہے۔ ملک کی وسعت سے نظم میں خلل کا اندیشہ رہتا ہے۔ چنانچہ روسو اپنی مشہور و معروف کتاب "معاہدۂ عمرانی" میں لکھتا ہے "قدرت نے ریاست کے ملک محروسہ کے لئے ایک حد مقرر کر دی ہے جیسا کہ

ایک اعلیٰ تناسب انسان کے لئے قد وقامت یہ حدبندی شہری ریاستوں کے لئے مناسب تھی۔ مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ ان تعریفوں کی کوئی عملی اہمیت نہیں۔ اسی دنیا میں مناکو (Manaco) اور سان میرینو (San Marino) جیسی چھوٹی ریاستیں بھی موجود ہیں اور روس اور امریکہ جیسی وسیع ریاستیں بھی قائم ہیں جن کی قلمرو کی وسعت لاکھوں مربع میل ہے۔

قلمرو کا اسلامی تصور اس پیش کردہ سیاسی تصور سے بالکل جدا ہے۔ پہلا اختلاف تو یہ ہے کہ خدائے پاک نے سمندر وغیرہ کو کسی کی ملکیت قرار نہیں دیا۔ ان سے جس طرح چاہے انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اسلامی قانون کی رو سے ریاست کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان فوائد پر پابندی عائد کرے چنانچہ ہدایہ میں ہے۔

الانتفاع بماء البحر کالانتفاع بالشمس والقمر والهواء۔ سمندر کے پانی سے استفادہ کی نوعیت وہی ہے جو آفتاب، ماہتاب اور ہوا سے استفادہ کا حکم ہے یعنی ہر شخص کو اس سے استفادہ کا عام حق حاصل ہے۔ (ہدایہ)

پس چرند، پرند، جمادات ونباتات پر اسلام پابندی عاید نہیں کرتا بلکہ ہوا اور روشنی کی طرح ان کو بھی عام مفاد کا منبع قرار دیتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلام میں ریاست کی ملکیت کا کوئی تصور نہیں۔ الملک للہ۔ تمام ملک اللہ کا ہے اور ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ جس حصہ پر جائز طور سے قابض ہو سکتا ہو۔ کوئی اسلامی ٹیکس زمین کے اوپر نہیں بتایا گیا۔ اس لئے کہ اسلام ملک محروسہ کو ریاست کی ملکیت تصور نہیں کرتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ ملک محروسہ کا تصور اسلام میں بالکل جدا ہے۔ نظم کی آسانی کے لئے ملک کی حدبندی کی جا سکتی ہے لیکن کوئی "امام" یا "خلیفہ" کے قانون سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا نہ ایک وقت میں دو خلیفہ حکومت کر سکتے ہیں۔ پس اس وسیع دنیا میں جہاں جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی وہ سب ایک امام کے ماتحت کام کرے گی اور ملکوں کو زبان ورنگ کے اعتبار سے جدا جدا حکومتوں میں منقسم نہیں کیا جا سکتا۔

وللہ المشرق والمغرب اور دکھیو پورب ہو یا پچھم، ساری دنیا اللہ ہی کے لئے ہے۔

(۳) بیرونی تسلط سے آزادگی

ریاست کو اندرونی اور بیرونی معاملات میں خود مختار ہونا ضروری ہے اور کوئی اندرونی یا بیرونی تسلط اس پر نہ ہونا چاہئے۔ ہندوستان کو لیجئے، آبادی، حکومت اور قلمرو کے باوجود ہم اس کو ریاست نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ ریاست کا ایک ضروری جزو اس میں نہیں پایا جاتا اور وہ یہی بیرونی تسلط سے آزادگی ہے۔ ہندوستان دوسروں کا محکوم ہے اور اس لئے ریاست کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔

اسی آزادگی کو انگریزی سیاست کی زبان میں (Sovereignty) کہتے ہیں۔ اردو زبان میں کوئی ایسا جامع لفظ موجود نہیں جو اس لفظ کا صحیح صحیح مفہوم ادا کر سکے۔ اس کا ترجمہ عام طور سے "فرمانروائی" "حکومت" وغیرہ کیا جاتا ہے جو سیاسی اصطلاحی زبان میں بالکل غلط ہے۔ یہ لغت لاطینی لفظ Superanus سے نکلا ہے جس کے معنی "اعلیٰ" "سب سے برتر" کے ہیں اور سب سے پہلے اس لفظ کو بوڈان (Bodin) نے اپنی مشہور تصنیف (De Le Republique) میں استعمال کیا تھا جو ۱۵۷۶ء میں شائع ہوئی۔ لیکن یہ خیال ارسطو کے زمانہ سے چلا آتا ہے۔

اسٹن (Austin) نے ساورینٹی (Sovereignty) کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"اگر ایک معین اعلیٰ بشر جو اپنے جیسے اعلیٰ کی تابعداری کا عادی نہ ہو۔ ایک متعین سوسائٹی کی کثیر تعداد سے دائمی تابعداری حاصل کرے تو وہ معین اعلیٰ اس سوسائٹی میں (Sovereign) ہے اور سوسائٹی (جس میں وہ اعلیٰ بشر بھی شامل ہے) ایک سیاسی اور آزاد سوسائٹی ہے۔"

ڈننگ (Dunning) نے اپنی کتاب (A History of Political Theories. جلد سوم صفحہ ۲۷) پر اس تعریف کے متعلق کہا ہے کہ "اس جملہ میں بدیہی طور پر ایک رنگ ہے انتہائی سائنٹفک صحت اور قطعیت کا۔"

یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ "ایک معین اعلیٰ بشر" سے مراد صرف ایک فرد ہی نہیں ہو سکتا بلکہ ایک جماعت، وہ اسمبلی ہو یا پارلیمنٹ بھی اسی "معین اعلیٰ بشر" میں شامل ہے۔

ساورینٹی کی تعریفیں بے شمار ہیں اور سیاسی فلاسفہ کا ایک گروہ سرے سے اس کا قائل ہی نہیں ان تمام تفصیلات پر بحث کرنا ان صفحات کا مقصد نہیں۔ ہم صرف بوڈان (Bodin) کی تعریف بغیر

تبصرہ کئے ہوئے اور شامل کئے لیتے ہیں۔

بوڈان کا خیال ہے کہ "ساورینی ٹی ایک اعلیٰ قوت ہے قانون سے آزاد شہریوں اور محکوموں پر عام طور سے ساورینی ٹی کے حسب ذیل پانچ لوازم قرار دیئے جاتے ہیں۔

(۱) دوام (Permanence)

(۲) غیر شاملیت (Exclusuieness)

(۳) جامعیت (All Comprehensiuness)

(۴) مطلقیت (Absolutism)

(۵) غیر منفک ہونا (Inalienability)

چونکہ یہ چیزیں جمع ہونا غیر ممکنات میں سے ہے اس لئے ارباب فلسفہ کا ایک گروہ ساورینی ٹی کا منکر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ساورینی ٹی ایک مسئلہ ہے جس سے نہ انکار کی گنجائش ہے اور نہ اقرار کی۔ اگر انکار کیا جائے تو ریاست کی ہنسی اڑانا ہے اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے عدم وجود کی صورت میں عنانِ حکومت کبھی کسی کے ہاتھ میں رہ بھی سکتی ہے۔ ایران میں بھی (Sovereignty) کا یہی تصور ملتا ہے اسی لئے مثل مشہور ہے کہ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ولایت میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اور اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر ریاست کو برتری حاصل نہیں تو آبادی کس کی وائی تابعداری کرے

ابتدا میں مذہب نے سیاست کو بہت متاثر کیا اور تمام سیاست مذہب کے ساتھ ساتھ چلتی تھی ساورینی ٹی کا یہ تصور بھی مذہب کی پیداوار ہے لیکن رفتہ رفتہ لوگ مذہب سے بدظن ہو کر صراط مستقیم سے بہک گئے اس لئے ساورینی ٹی کی وہ خصوصیات جو صرف خدا ہی کے لئے زیبا ہیں انسانوں سے متعلق کر دیں اور آج کوئی نہیں جو اس کے خلاف آواز بلند کر سکے اسلام کا اس معاملہ میں صاف فیصلہ یہ ہے کہ ع

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

انسان خدا کا خلیفہ ہے اور تمام قوت و طاقت اللہ سے بلا واسطہ حاصل ہوتی اور ساورینی ٹی کے لوازم سوائے خدا کی طاقت کے اور کہیں دستیاب بھی نہیں ہو سکتے۔

الم تعلم ان اللہ لہ ملک — اور پھر کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لئے آسمان و
السمٰوٰت والارض۔ — زمین کی سلطانی ہے۔
وللہ المشرق والمغرب — اور دیکھو پورب ہو یا پچھم ساری دنیا اللہ ہی کے لئے ہے۔

پس اسلام کے نظریہ کے مطابق ساورینٹی صرف خدا کو حاصل ہے اور امام اس کی طرف سے دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ اگر وہ خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر ٹھیک چلتا ہے تو "اولوالامر منکم" کے حکم کے مطابق بلا چون و چرا اس کے احکام کی تعمیل ہر فرد پر واجب ہے اور اسی معنی میں اسلامی ریاست کو ساورینٹی حاصل ہے لیکن یہ فیصلہ کہ امام درحقیقت خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر ہے یا نہیں اور اولوالامر منکم کا حکم واجب آتا ہے یا نہیں، جمہور کے ہاتھ میں ہے اور سیاست کا یہ جھگڑا کہ ساورینٹی ریاست میں کس کو حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے آسانی سے حل ہو جاتا ہے کہ دنیاوی حکومت میں ساورینٹی جمہور کا حصہ ہے جو خدا کی ساورینٹی کی محافظت میں اس کے احکام کے مطابق اس کی دی ہوئی قوت کو استعمال کرتے ہیں۔

(۴) حکومت | یہ لفظ عام طور پر غلط استعمال ہوتا ہے عوام اس کو ریاست کے مترادف استعمال کرتے ہیں لیکن حقیقت میں حکومت صرف ریاست کا ایک جزء ہے۔ حکومت وہ سیاسی نظام ہے جس کے ذریعہ سے ریاست اپنے احکام کا نفاذ کرتی ہے۔ موجودہ حکومتوں کے لحاظ سے اس پر کتابوں کی کتابیں تصنیف کی جا سکتی ہیں کہ کس قسم کی حکومت ہونی چاہیئے۔ ڈکٹیٹر شپ ہو یا صدارت جمہوریہ، یا پارلیمنٹری سلطانی وغیرہ وغیرہ

اسلام نے حکومت کے لئے ایک جامع قانون بنا دیا ہے جس کو شریعت کہتے ہیں۔ تمام جمہور مل کر اسلامی پارلیمنٹ بنتی ہے اور امام کچھ نہیں ہے۔ امام جمہور کی رضا تک کام کر سکتا ہے اس کے لئے کوئی وقت کا سوال ہے اور نہ کسی استحقاق کا سوال، وہ ایک طرف خدا کو جوابدہ ہے اور دوسری طرف جمہور کا۔

ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا — ہم اپنے احکام میں سے کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس جگہ اس سے بہتر یا
نات بخیر منھا او مثلھا — کم ازکم اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں (پس اگر اب ایک نئی شریعت ظہور میں آئی ہے تو
(الآیہ) — یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر لوگوں کو حیرانی ہو۔

اللہ کا یہ حکم آخری شریعت کے ظہور پر نازل ہوا۔ اور پھر خدا نے فرمایا کہ

اکملت لکم دینکم

پس موجودہ شریعت، مسلمانوں کے لئے قیامت تک کے لئے ایک جامع قانون ہے اور دنیاوی زندگی کا کوئی جزو ایسا نہیں جس کے متعلق احکامات قرآنِ عزیز اور احادیث سے حاصل نہ کئے جاسکتے ہوں اللہ پاک کس قسم کی حکومت پسند کرتا ہے اس کا جواب خدا کے اس عتاب سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے نافرمانوں پر نازل کیا۔

واذا تولّٰی سعٰی فی الارض	اور جب انھیں حکومت مل جاتی ہے تو اس کی تمام سرگرمیاں
لیفسد فیھا ویھلك الحرث	ملک میں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ خرابی پھیلائیں۔ اور
والنسل واللہ لا یحب	انسان کی زراعت و محنت کے نتائج اور اس کی نسل
الفساد۔ (القرآن)	ہلاک کردیں حالانکہ اللہ یہ کبھی پسند نہیں کرسکتا کہ زندگی و آبادی

زندگی کے لئے خدا کا بنایا ہوا ایک سب سے جامع قانون حسب ذیل ہے "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" پس مسلمان کا ہر عمل صحیح اور قاعدہ کے مطابق ہونا چاہئے اور جو عمل اچھا ہوگا وہ دوسروں کے لئے مفید ہوگا اور اسی طرح ملت معراج پر پہنچ سکتی ہے اور دراصل یہی جذبات اور یہی دنیا داری ملت بناتی ہے۔

خدا ایک ہے اور خدا کی وحدانیت سے انسانی نسل کی وحدانیت کا فلسفہ پیدا ہوتا ہے، خدا کی نگاہ میں سب لوگ یکساں ہیں اور وہ تنہا ان سب کا مالک ہے۔ ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر۔ اس نے تمام انسانی نسل کے لئے ایک مستقل اور جامع قانون بنا دیا ہے جس کے اندر تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

اشتراکیت، اشتمالیت وغیرہ وغیرہ سب زندگی کا مادی تصور پیش کرتے ہیں اور ملت پروری وغیرہ قومی اور ملکی عصبیت پیدا کرتے ہیں۔ اسلام تمام دنیا کے لئے ایک پیغام مساوات ہے وہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اسلام کا اخلاقی پہلو قبول کرلیں اور اس کے تصور ریاست سے انکار کردیں۔

باید ہمہ نوشتند چشمدان نہ گزارند